

## سنت اور حدیث

### تصور سنت پر تفصیلی بحث

ڈاکٹر فضل الرحمن

اس سے پہلے ہم اس امر پر زور دے چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ایک مثالی تصور کی حیثیت رکھتی ہے جس سے قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے اس نئے مواد کی روشنی میں جو انہیں دستیاب ہو سکا اور نئی ضروریات کے مطابق اسوۂ رسول کی تعبیر و ترجمانی کے ذریعہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ قریب تر لانے کی کوشش کی اور اس مسلسل اور ترقی پذیر تعبیر و ترجمانی کو بھی سنت سے موسوم کیا گیا اگرچہ مختلف دیار و اقصاء کی سنت میں اختلافات موجود تھے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جو نشوونما اور ارتقاء عمل میں آیا اور جو علم حدیث کی تدوین کے بعد اتنا جدید اور انقلاب انگیز معلوم ہوتا ہے اس کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لئے مناسب ہوگا کہ ہم حدیث پر بحث کرنے سے قبل اس مسئلہ پر مزید توجہ مبذول کریں۔

امام ابو یوسف نے اپنی کتاب ”الرد علی سیر الاوزاعی“ میں امام ابو حنیفہ کی یہ رائے بیان کی ہے کہ اگر غیر مسلموں کے ملک میں کوئی شخص مسلمان ہو جائے اور اپنا گھر بار چھوڑ کر مسلمانوں کی جماعت میں شمولیت اختیار کر لے تو اس صورت میں اگر مسلمان اپنی فوجی طاقت سے اس ملک پر قبضہ کر لیں تو اس شخص کی جائداد اسے واپس نہیں کی جائے گی بلکہ اس کا شمار مال غنیمت میں ہوگا۔ شامی

فقہ اوزاعی امام ابو حنیفہ کی اس رائے کو مسترد کرتے ہوئے رسول اللہ صلعم کے عمل سے استدلال کرتے ہیں کہ آپ نے فتح مکہ کے بعد ان مسلمانوں کی جائداد واپس کر دی تھی جنہوں نے مکہ چھوڑ کر مدینہ کے مسلمانوں کے ساتھ سکونت اختیار کی تھی۔ امام ابو یوسف کے قول کی رو سے اوزاعی کی دلیل یہ تھی کہ ”جو شخصیت سب سے زیادہ لائق اتباع ہے اور جس کی سنت کا التزام سب سے زیادہ ضروری ہے وہ رسول اللہ کی شخصیت ہے“ ابو یوسف امام ابو حنیفہ کی حمایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا عمل امام ابو حنیفہ کی رائے سے مطابقت رکھتا ہے اور رسول اللہ صلعم نے اہل مکہ کے ساتھ جو طرز عمل برتا وہ ایک استثناء ہے، سنت جاریہ یہی رہی ہے اور اسلام کا عمل بھی یہی تھا اگرچہ رسول اللہ نے فتح مکہ کے موقع پر ایسا نہیں کیا“ اس کے بعد ابو یوسف کہتے ہیں کہ بنی ہوازن کے معاملہ میں ”رسول اللہ کی سنت“ اس سے بھی زیادہ مختلف تھی۔ بنی ہوازن جب مسلمانوں سے شکست کھا گئے تو انہوں نے رسول اللہ صلعم کے پاس آکر رحم و کرم کی درخواست کرتے ہوئے اپنے قیدیوں اور اپنی جائداد کی واپسی کے لئے استدعا کی۔ رسول اللہ نے مال غنیمت میں سے اپنا ذاتی حصہ انہیں واپس کر دیا اور دوسرے مسلمانوں نے بھی آپ کی پیروی میں یہی کیا صرف چند قبائل ایسے تھے جنہوں نے اپنا حصہ واپس دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد رسول اللہ نے ان قبائل کو معاوضہ دیکر بنی ہوازن کو باقی مال واپس کر دیا نیز ان کے وہ افراد جنہیں غلام یا باندی بنالیا گیا تھا آزاد کر کے انہیں واپس کر دئے گئے (۱)

متذکرہ بالا بیان میں پہلا امر جو قابل توجہ ہے وہ امام اوزاعی کا یہ قول ہے کہ ”وہ شخصیت جس کی سنت پیروی کی سب سے زیادہ مستحق ہے رسول اللہ کی شخصیت ہے“ اس میں صاف طور پر یہ امر مضمون ہے کہ (الف) سنت یا مستند نظیر کوئی شخص بھی قائم کر سکتا ہے جس میں اس کی اہلیت موجود ہو اور (ب) رسول اللہ کی سنت ایسے تمام نظائر پر محیط اور ان سب حیثیتوں سے مقدم ہے۔ لیکن دوسرا امر جو یکساں اہمیت رکھتا ہے سنت کا وہ مفہوم ہے جس میں امام ابو یوسف اس اصطلاح کو متذکرہ بالا بیان میں استعمال کرتے ہیں۔ امام صاحب موصوف پہلے مسئلہ زیر بحث کے تعلق سے سنت کے دو

مفہوموں میں امتیاز کرتے ہیں یعنی سنت ایک طرف اس عمل کے اعتبار سے جو مسلمانوں میں رائج تھا اور دوسری طرف اس خصوصی عمل کی رو سے جو رسول اللہ صلعم سے فتح مکہ کے موقع پر سرزد ہوا۔ رسول اللہ صلعم کے اس مؤخر الذکر عمل کو امام ابو یوسف ایک استثنائی صورت قرار دیتے ہیں اور اسی لئے یہ ان کے نزدیک سنت کے مفہوم میں داخل نہیں ہے لیکن امام اوزاعی کے نزدیک رسول اللہ صلعم کا یہ عمل عین سنت تھا اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تعبیرات کے اختلافات کے باعث دونوں فقیہ متضاد نتائج اخذ کرتے ہیں لیکن سب سے زیادہ دلچسپ امر ہمارے لئے لفظ «سنت»، کا وہ استعمال ہے جو امام ابو یوسف اپنے دوسرے بیان میں کرتے ہیں جہاں وہ بنی ہوازن کے تعلق سے رسول اللہ کی سنت کا ذکر کرتے ہیں یہ صورت بھی امام یوسف کے نزدیک سنت کے عام اصول کا ایک استثناء ہے لیکن سنت کے اس استثناء کو بھی امام صاحب سنت کی اصطلاح سے موسوم کرتے ہیں اس لئے بدیہی طور پر یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جب صورت حال کا یہ تقاضا ہو تو عام قاعدہ کے استثناء پر بھی قاعدہ ہی کا اطلاق کیا جائے گا۔ جب ہم مفہوم (ب) میں سنت کو ایک ٹھوس اور متعین صورت دینے کی کوشش کرتے ہیں یعنی وہ سنت جو امت کے واقعی عمل سے عبارت ہے تو ہمیں سنت رسول کی اس آزاد تعبیر میں اور زمانہ ما بعد کے فقہاء نے سنت کے جس جامد اور بے لچک عقیدہ کی تشکیل کی اس میں ایک عجیب و غریب بعد نظر آتا ہے۔ یہاں صورت حال کی خصوصیات کے اعتبار سے رسول کے عمل و کردار کی ایک حرکت پذیر لہر ہے جو آزادی کے ساتھ رواں ہے، وہاں چند جامد قواعد و ضوابط ہیں جو ایک بار وضع کئے جانے کے بعد ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہتے ہیں۔ یہاں جن مقاصد و غایات کے حصول کے لئے رسول اللہ صلعم سرگرداں تھے ان کی مسلسل اور انتھوک تلاش و جستجو ہے، وہاں ضوابط کا ایک بے لچک اور متعین نظام ہے جس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تحریفات کے آہنی شکنجہ میں کس دیا گیا ہے۔

دارالہرب میں غلام بنائے جانے والے اشخاص کے متعلق امام ابو حنیفہ کی رائے یہ ہے کہ دارالاسلام میں لائے سے قبل ان کی خرید و فروخت مکروہ ہے۔ اس پر امام اوزاعی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں «مسلمان ہمیشہ سے دارالہرب میں جنگی قیدیوں کی خرید و فروخت کرتے رہے ہیں۔ خلیفہ ولید کے قتل تک

مسلمانوں میں اس مسئلہ کی نسبت باہم اختلاف رائے نہیں ہوا۔“ اس پر امام ابو یوسف اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں - ”کسی امر کے جائز یا ناجائز ہونے کو اس قسم کے بیانات پر مبنی نہیں قرار دیا جاسکتا کہ اور لوگوں کا ہمیشہ سے ایسا عمل رہا ہے۔ اسلئے وہ لائق عمل ہے۔ کیونکہ تعامل الناس کے مطابق فیصلہ یا تو سنت رسول پر مبنی ہونا چاہئے یا سلف کی سنت یعنی سنت صحابہ اور ان لوگوں کی سنت پر جنہیں فقہ میں درک ہو“ (۲) پھر حجازی فقیہوں کے تصور سنت پر تنقید کرتے ہوئے امام ابو یوسف لکھتے ہیں ’حجاز کے فقیہ جب کبھی کسی امر کا فیصلہ کرتے ہیں اور ان سے سند طلب کی جاتی ہے تو عموماً وہ جواب دیتے ہیں کہ ’قائم شدہ سنت یہی ہے‘ حالانکہ غالباً یہ سنت کسی عامل السوق یا بیرونی ضلع کے کسی محصول وصول کرنے والے افسر کے فیصلہ پر مبنی ہوتی ہے“ (۳) ان مباحث، دلائل اور تردیدی دلائل سے بعض اہم نتیجے اخذ کئے جاسکتے ہیں: اولاً ’سنت کا تصور جس طرح کہ اس اصطلاح کو ائمہ فقہاء نے اوائل اسلام میں استعمال کیا۔ اگرچہ نصب العین اور ’مثالی حیثیت سے اسوہ رسول تک منتمی ہوتا ہے لیکن واقعی مواد کے اعتبار سے وہ امت کے عمل پر بھی حاوی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امام اوزاعی بار بار اس قسم کے فقرات استعمال کرتے ہیں جیسے ’مسلمانوں کا عمل‘، ’ائمہ المسلمین یعنی مسلمانوں کے سیاسی (اور عسکری) رہنماؤں کا عمل اور ’اجماع علما‘ اور ان فقرات کو وہ یقیناً ایک ہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں یعنی ان کے نزدیک یہ سب مترادفات ہیں‘ امام مالک بالکل اسی طرح تعامل اہل مدینہ کی اصطلاح کا استعمال کرتے ہیں۔ اب یہ امر بالکل واضح ہے کہ یہاں ہمیں اوائل اسلام کے مسلمانوں کے زندہ اور جاری عمل سے واسطہ ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ یہ سنت جسے ہم نے حصہ اول میں مفہوم (ب) کی رو سے سنت کہا ہے بعینہ وہی چیز ہے جسے اجماع امت کہا جاتا ہے اور اس میں علماء کے فیصلے نیز سیاسی حکام کے وہ فیصلے بھی شامل ہیں جو وہ روز مرہ کے امور نظم و نسق کی نسبت کرتے رہتے تھے۔ دوسرا اہم امر جو مذکورہ بالا بحث سے واضح ہو جاتا ہے یہ ہے کہ اگرچہ ’زندہ اور جاری سنت‘ ابھی تک ایک ایسا عمل ہے جس کی نگاہیں اجتہاد و اجماع کے باعث مستقبل پر جمی ہیں لیکن دوسری صدی کے وسط میں

فقہی نظام کے نظری پہلو میں ایک تبدیلی کا آغاز ہوتا ہے جو امام ابو یوسف کی تحریروں میں نظر آتا ہے اور عراق میں سب سے پہلے شعوری طور پر ابھرتا ہے۔ یہ تبدیلی اس طرح شروع ہوتی ہے کہ فقہاء عراق ”زندہ اور جاری سنت“ کی نسبت ایک تنقیدی رویہ اختیار کرتے ہیں اور استدلال یہ کرتے ہیں کہ کسی قاضی یا سیاسی رہنما کے ہر ہر فیصلہ کو جزو سنت قرار دینا درست نہیں اور صرف ان علماء کو جو فقہ میں درک رکھتے ہوں اور اعلیٰ قسم کی فہم و بصیرت سے بہرہ ور ہوں یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ”زندہ سنت“ کے مفہوم و مواد کو وسعت دیں۔ ”زندہ اور جاری سنت“ کے تصور کو رد نہیں کیا جاتا ہے لیکن ایک پختہ اور یقینی طریق کار کی تلاش ضرور جاری ہے جس پر ”زندہ اور جاری سنت“ کی بنیاد رکھی جاسکے۔

### علم حدیث کی ابتدائی نشو و نما

اس حقیقت میں شک و شبہ کی ذرا بوی گنجائش نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ابتداً اسلام سے موجود تھی۔ دراصل یہ ایک بالکل فطری امر تھا کہ رسول اللہ صلعم کے جن حیات مسلمان آپ کے اعمال و اقوال کی نسبت خصوصاً اگر وہ امور مملکت یا امت کی فلاح و بہبود یا عام معاملات دنیا و دین سے متعلق ہوں باہم گفتگو کریں۔ عرب جنہوں نے اپنے شعراء کے اشعار اور نظموں، اپنے کاهنوں کے اقوال، اپنے حکموں اور قبائلی سرداروں کے فیصلوں کو، حفظ کر کے انہیں اخلاف تک پہنچایا اس ہستی کے اعمال و اقوال سے کس طرح غفلت برت سکتے تھے جسے وہ خدا کا رسول اور مہبط وحی الہی تسلیم کرتے تھے؟ اس فطری امر کا انکار نہ صرف احقرانہ فعل ہے بلکہ درحقیقت یہ اپنی ساری تاریخ کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ ان کے لئے نئی سنت یعنی رسول اللہ کی سنت اتنی اہمیت رکھتی تھی (اور اس کی اہمیت پر خود قرآن میں اتنا زور دیا گیا ہے) کہ اسے نظر انداز کر دینا یا اس سے تجاہل برتنا مسلمانوں کے لئے ایک امر ناممکن تھا۔ جیسا کہ ہم نے اس مقالہ کے حصہ اول میں بیان کیا ہے یہ حقیقت اسلام کی مذہبی تاریخ میں روز روشن کی طرح ہویدا اور ظاہر و باہر ہے اس لئے اس سے انکار کرنے کی کوشش کسی پہلو سے بھی کی جائے خواہ وہ مذہبی ہو یا تاریخی ایک طفلانہ اور مضحکہ

انگیز کوشش ہے۔ امت مسلمہ کی سنت رسول اللہ صلعم کی سنت پر مبنی اور اس سے ماخوذ ہے۔

امور مندرجہ بالا کے باوجود عہد رسالت میں حدیث زیادہ تر ایک رسمی اور بے ضابطہ نوعیت رکھتی تھی کیونکہ اس کے ذریعہ جو واحد ضرورت تکمیل پاتی تھی وہ یہ تھی کہ حدیث کے واسطے سے مسلمانوں کی عملی رہنمائی کی جاسکے لیکن اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اس وقت تک مسلمانوں کے درمیان خود ذات رسالت کا موجود ہونا کافی تھا۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد حدیث کو پورے طور پر تو نہیں لیکن ایک حد تک باضابطہ حیثیت حاصل ہو گئی کیونکہ آنے والی نسل کے لئے یہ ایک بالکل قدرتی امر تھا کہ وہ رسول اللہ کے حالات کی جستجو اور آپ کے طرز عمل کے بارے میں کد و کاوش کرے لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ اس مرحلہ پر بھی حدیث کی کوئی باقاعدہ تدوین عمل میں آئی ہو۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی تھی کہ اس وقت تک جتنی احادیث موجود تھیں وہ مسلمانوں کے عملی اغراض کی تکمیل کے لئے کفایت کرتی تھیں یعنی ان سے امت کا عمل تشکیل پاتا رہتا تھا اور انہیں وسعت دیکر امت اپنے عمل کے سانچے میں ڈھال لیتی تھی۔ اس وجہ سے ارباب حکومت اور قضاة دونوں نے پیش نظر صورت حالات کے مطابق اس کی آزادانہ تعبیر کی اور اس تعبیر کے نتیجہ میں جو شئے وجود میں آئی وہ وہی تھی جیسے ہم نے زندہ اور جاری سنت سے موسوم کیا ہے۔ لیکن جب پہلی صدی ہجری کے آخری نصف حصے میں مسلمانوں کی روزمرہ کی عملی زندگی کے تقاضوں کی تکمیل کی خاطر تعبیر و ترجمانی کے اس عمل کے ذریعہ اسلامی خلافت کے مختلف علاقوں میں رسول اللہ صلعم کی زندہ اور جاری سنت کا پھیلاؤ بہت زیادہ بڑھ گیا اور فقہی نظامات نیز فقہی امور کو برتنے کے طریقوں میں اختلاف کی خلیج وسیع تر ہوتی گئی تو حدیث نے ایک باقاعدہ علم کی صورت اختیار کر لی۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ راویان حدیث کی سرگرمیاں قاضیوں اور فقہوں کے عمل اور طریق کار سے نہ صرف غیر متعلق تھیں بلکہ بسا اوقات ان کے علمی الرغم جاری تھیں۔ فقہاء اپنے فقہی امور زندہ اور جاری سنت کی بنا پر طے

کرتے تھے اور فقہ کی توسیع کی غرض سے اپنی ذاتی رائے کے ذریعہ حاصل شدہ مواد کی آزادانہ تعبیر کرتے تھے۔ اس کے برعکس راویان حدیث اپنا بنیادی کام یہ سمجھتے تھے کہ وہ صرف روایت پر اکتفا کریں کیونکہ ان کی غرض یہ تھی کہ کس طرح فقہی نظام میں ثبات و استقرار پیدا ہو۔ اگرچہ قلت مواد کے باعث یہ معلوم کرنا ممکن نہیں کہ فقہاء اور راویان حدیث کا ٹھیک ٹھیک کیا تعلق تھا لیکن یہ امر یقینی ہے کہ بالعموم یہ دونوں فریق ایک قسم کے تناؤ کے دو سرے تھے جن میں سے ایک فقہ کی نشو و نما اور ترقی کا معاون تھا اور دوسرا اس میں ثبات و استقرار پیدا کرنا چاہتا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ دوسری صدی ہجری کی جو تصانیف ہم تک پہنچی ہیں ان کا سلسلہ روایت صحابہ بلکہ تابعین اور تبع تابعین تک آکر ختم ہو جاتا ہے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا معلوم ایسا ہوتا ہے۔ گویا حدیث کی تحریک نے داخلی تقاضے سے مجبور ہو کر سلسلہ روایات کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے اس کے فطری مرکز و محور یعنی ذات رسالت تک پہنچا دیا۔ ابتدائی فقہی مذاہب نے جو زندہ اور توسیع پذیر سنت پر، نہ کہ بنی بنائی اور جمجمہ آراء کے کسی مجموعہ پر مبنی تھے، قدرۃً اس میلان کی مزاحمت کی۔ ہم نے اس مقالے کے پہلے حصہ میں بتایا ہے کہ امام شافعی رح نے اس سلسلہ میں کیا کام کیا اور کن رجحانات کو قوت دی۔ امام شافعی فقیہوں پر مسلسل الزام دیتے ہیں کہ وہ روایت ایجادیت میں کوتاہی کرتے ہیں اور جن تھوڑی بہت حدیثوں کی روایت بھی کرتے ہیں فقہ میں ان سے مطلق استفادہ نہیں کرتے (۴) اس قسم کے اعتراضات امام شافعی نے خاص طور پر حجازیوں کے خلاف وارد کئے ہیں لیکن عراقیوں کو بھی تقریباً وہ ان ہی اعتراضات کا نشانہ بناتے ہیں۔

دوسری صدی ہجری کے وسط تک تحریک حدیث کافی ترقی کر چکی تھی اور اگرچہ اکثر احادیث اب تک رسول اللہ کی طرف نہیں بلکہ دیگر شخصیتوں کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ مثلاً صحابہ۔ اور خصوصاً دور صحابہ کے بعد کے اشخاص کی جانب لیکن اوائل عہد اسلام کے مسلمانوں کی اکثر فقہی آراء اور ان کے وہ مذہبی عقائد جو زمانہ مابعد کی پیداوار تھے رسول اللہ صلعم کی جانب منسوب کئے جانے لگے تھے۔ اس دعویٰ کے تفصیلی شواہد ہم آگے چاکر پیش کریں گے۔ اس کے باوجود حدیث کی تعبیر و تاویل میں بڑی آزادی برتی جاتی

تھی۔ مقالے کے حصہ اول میں ہم نے شواہد و دلائل کے ساتھ امام مالک کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ اصولی طور پر تعامل اہل مدینہ کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں اور ان کی بیشتر تعبیرات ذاتی آراء پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس حصہ کی ابتداء میں ہم نے یہ بھی بتایا ہے کہ امام اوزاعی نے جن احادیث کو بطور دلائل پیش کیا، امام ابو یوسف ان کی تعبیر صورت حالات کے اعتبار سے کرتے ہیں۔ امام صاحب موصوف کی تصانیف ایسی مثالوں سے پرے ہیں، ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ امام ابو یوسف کا ائمہ فقہاء کی نسبت تصور یہ تھا کہ وہ سنت نبوی کی توسیع اور زندہ سنت کی تخلیق کرنے کا کام سر انجام دے رہے ہیں۔ وہ ہر ایسی حدیث کو رد کر دیتے ہیں جو عام سنت کے بالمقابل ایک استثنائی صورت کی حیثیت رکھتی ہو۔ اس سے ان کی مراد وہ احادیث ہیں جنہیں بعد میں اخبار احاد کے نام سے موسوم کیا گیا کیونکہ وہ ایک ہی سلسلہ روایت سے مروی تھیں۔ مثلاً جو شخص جہاد کے لئے دو گھوڑے مہیا کرے اس کے متعلق امام ابو حنیفہ کی رائے یہ ہے کہ اسے مال غنیمت میں سے صرف ایک گھوڑے کا حصہ ملنا چاہئے۔ دوسری طرف امام اوزاعی کے نزدیک دونوں گھوڑے اپنے حصہ کے مستحق ہونگے۔ اس سلسلہ میں وہ حدیث اور سنت دونوں سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”اس حدیث سے تمام علماء واقف ہیں۔ اسی کے مطابق ہمارے سیاسی رہنما عمل کرتے رہے ہیں“ (۵) غالباً شام کے ارباب حکومت کا عمل درآمد یہی تھا۔ اس پر امام ابو یوسف تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”رسول اللہ یا صحابہ کرام سے ہمیں سوائے ایک کے کوئی ایسی روایت نہیں ملی جس کی رو سے مال غنیمت میں سے دونوں گھوڑوں کو حصے دئے جائیں لیکن ایک اکیلی حدیث کو ہم استثنائی صورت قرار دیتے ہیں اور اس پر عمل کو جائز نہیں سمجھتے۔ جہاں تک امام اوزاعی کے اس بیان کا تعلق ہے کہ ’سیاسی رہنماؤں کا عمل یہی رہا ہے اور علماء کی رائے بھی یہی ہے‘ یہ بالکل اہل حجاز کے اس دعویٰ کے مماثل ہے کہ ’قائم شدہ سنت یہی ہے‘ لیکن ہمارے نزدیک جہلاء کی رائے کو مستند نہیں قرار دیا جاسکتا۔ سوال یہ ہے کہ کس سیاسی راہ نمائے اس پر عمل کیا اور کس عالم نے اس کی صحت تسلیم کی“ (۶)۔



اپنی اس تصنیف میں امام ابو یوسف لوگوں کو عام طور پر متنبہ کرتے ہیں کہ وہ ”احادیث کو من وعن اور بلا جرح و تنقید تسلیم نہ کریں احادیث کی تعداد اتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ جن احادیث کی سلسلہ بسلسلہ روایت کی جاتی ہے، ماہرین فقہ ان سے بالکل واقفیت نہیں رکھتے اور نہ وہ قرآن و سنت سے مطابقت رکھتی ہیں۔ اکیلی حدیثوں سے جو استثنائی صورتوں سے متعلق ہوں خبردار ہو اور جماعت و نیز احادیث کی اجتماعی روح سے علیحدگی نہ اختیار کرو“ (۷) اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اسی لئے قرآن و سنت کی راہ نمائی اختیار کرنی ضروری ہے (۸) اس طرح امام ابو یوسف حدیث یعنی معروف عام سنت کی اجتماعی روح یا اس کے مزاج کو ایک معیار قرار دیتے ہیں۔ اجتماعیت یا اجتماعی مزاج و فطرت کے الفاظ بڑے معنی خیز ہیں اور اس مقالہ کے حصہ چہارم میں ہم بتائیں گے کہ سنت کی اصطلاح سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے یعنی ان منوعوں میں جن میں بعد میں اہل سنت و الجماعت کی اصطلاح کا استعمال کیا گیا۔ امام ابو یوسف خود رسول اللہ صلعم اور صحابہ کرام سے بہت سی احادیث روایت کرتے ہوئے مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ وہ احادیث کو قبول کرنے میں احتیاط برتیں بلکہ وہ ایسی احادیث بھی روایت کرتے ہیں جن سے صریحاً حدیث کا استرداد ثابت ہوتا ہے (۹) حدیث کی مخالفت میں جو حدیثیں روایت کی جا رہی تھیں ظاہر ہے کہ وہ تحریک حدیث کی کامیابی کی وجہ سے معرض ظہور میں آئی تھیں اور ان کا ظہور اس تحریک کے فروغ کا ایک منطقی اور ضروری نتیجہ تھا لیکن اغلب یہ ہے کہ حدیث کی مخالفت میں جو احادیث ظہور میں آ رہی تھیں وہ زمانی اعتبار سے ان احادیث سے مقدم تھیں جن سے حدیث کی تائید و موافقت ہوتی ہے۔ یہ چیز تحریک حدیث کا جزو فطرت تھی۔ علاوہ ازیں امام ابو یوسف کی تحریروں میں ہمیں مخالف حدیث احادیث تو ضرور ملتی ہیں لیکن حدیث کی موافقت میں کوئی حدیث نہیں ملتی۔ اس قسم کی احادیث زمانہ مابعد تک منظر عام پر نہیں آئیں اور امام شافعی جو حدیث کے سب سے بڑے موافقین بلکہ تحریک حدیث کے سرگروہوں میں سے ہیں صرف دو یا تین ایسی حدیثیں پیش کرتے ہیں (جن پر ہم بعد میں بحث کریں گے) اور حدیث کی قبولیت کے لئے جو دلائل لاتے ہیں وہ زیادہ تر تاریخی مواد یا قرآن مجید سے ماخوذ ہیں۔

امام ابو یوسف رسول اللہ صلعم سے وضع حدیث کی نسبت کئی حدیثیں روایت کرتے ہیں جن میں وہ حدیث بھی ہے، جس نے آگے چلکر صحاح کی کتابوں میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا اور جس میں کہا گیا ہے - ”من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار“ (جس نے جان کر مجھ پر جھوٹ بولا اس نے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالیا) لیکن اس حدیث کی مخالفت ایک اور حدیث کے ذریعہ کی گئی جس میں رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں - ”جو کوئی اچھی بات تمہیں منے تم سمجھو کہ میں نے کہی ہے“ -

تکثیر حدیث کے خلاف امام ابو یوسف کی تمام اجتیاظی تدابیر کے باوجود اس زمانہ تک متعدد احادیث کا سلسلہ رسول اللہ صلعم تک ملایا جا چکا تھا - مثلاً کتاب الاثار میں عمیر بن یونس نے ”حدثنا یوسف عن ابیہ عن ابی حنیفۃ عن حماد عن ابراہیم عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت ان البلاء مؤکل بالکلام“ (۱۰) یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ”بلائیں کلام کا نتیجہ ہیں“ دوسری جگہ انہی الفاظ میں یہ حدیث ابن مسعود سے مروی ہے - ایک اور حدیث میں ایک جبر پستندانہ دینیاتی عقیدہ کو خود جناب رسالت مآب کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں ”قال حدثنا یوسف عن ابیہ عن ابی حنیفۃ عن ابن الزبیر عن جابر رضی اللہ عنہ ان سراقہ بن مالک قال فحدثنا عن دیننا هذا کانا خلقنا له الساعۃ نعمل لشیئ قد جرت به المقادیر وجفت به الاقلام ام لشیئ یتقبل قال : بل لشیئ قد جرت به المقادیر وجفت به الاقلام قال ففیم العمل یا رسول اللہ صلعم قال اعملوا فکل ميسر لما خلق - قال ثم قرء هذه الایة فاما من اعطی واتی وصدق بالحسني الی آخر الایة“ . یعنی سراقہ بن مالک رسول اللہ صلعم سے دریافت کرتے ہیں کہ ہمارے دین کے متعلق فرمائیے کہ کیا ہم اس دین کے لئے عین وقت پر پیدا کئے گئے ہیں تو کیا ہم کسی ایسی چیز کے لئے عمل کر رہے ہیں جو کلام الہی کے تحت پہلے

ہی سے متعین ہو چکی ہے اور جس پر قلم خشک ہو چکا ہے یا ہم کسی ایسے امر کے لئے عمل کریں جس کا تعین مستقبل میں ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسی چیز کے لئے جو حکم الہی کے تحت میں متعین کی جا چکی ہے اور جس پر قلم خشک ہو چکا ہے۔ اس پر سراقہ نے سوال کیا کہ پھر ہمارا عمل کس لئے ہے۔ رسول اللہ نے جواب دیا عمل کئے جاؤ، کیونکہ ہر شخص کے لئے وہ عمل آسان کر دیا گیا ہے جس کیلئے اسے بنایا گیا ہے اس کے بعد قرآن کی یہ آیت پڑھی۔ واما من اعطی واتق وصدق بالحسني۔ یعنی جس نے خدا کی راہ میں دیا اور خدا سے ڈرا اور تقویٰ اختیار کیا اس کے ہم نیک عمل آسان بنا دیتے ہیں (۱۱) حصہ چہارم میں جب ہم اس امر سے بحث کریں گے کہ مسلمانوں میں عقائد کا جمود کیونکر پیدا ہوا تو اس امر کی توضیح کریں گے کہ جبر و اختیار کے مباحث کی نوعیت کیا تھی اور انہوں نے مسلمانوں کی دینی تاریخ کے نشو و نما میں کیا حصہ لیا جس کا نتیجہ متذکرہ بالا نوعیت کی احادیث میں ظہور پذیر ہوا۔ قرآن کی جس آیت کا حوالہ اس حدیث میں دیا گیا ہے وہ جبر کے عقیدہ کی کھلی ہوئی ضد ہے جس کی تلقین حدیث میں کی گئی ہے۔

قرب قیامت کے متعلق بھی ایک حدیث ابتدائی مگر قطعی صورت میں ملتی ہے جس میں ظہور مسیح کی خبر پنہاں ہے اگرچہ یہ حدیث رسول اللہ کی جانب نہیں بلکہ عبدالاعلیٰ کی جانب منسوب ہے جنہیں قاضی یا قاص (قصے بیان کرنے والے) کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے غالباً یہ آخر الذکر حیثیت زیادہ مستند ہے۔ سیاسی حدیث کی ایک مثال یہ ہے۔

قال حدثنا يوسف عن ابيه عن ابى حنيفة ان رجلاً اتى علياً رض فقال ما رأيت احداً خيراً منك . فقال له هل رأيت النبي صلعم قال لا قال فهل رأيت ابا بكر وعمر رض . قال لا . قال لو اخبرتني انك رأيت النبي صلي الله عليه وسلم ضربت عنقك ولو اخبرتني انك رأيت ابا بكر وعمر رضى الله عنهما لا وجعتك عقوبة ، ، یعنی ایک شخص حضرت

علی رض کے پاس آیا اور کہا میں نے آپ سے زیادہ بہتر کوئی شخص نہیں

دیکھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کیا تم نے رسول اللہ کو دیکھا تھا۔ اس شخص نے جواب دیا نہیں، آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا ہے اس نے کہا نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تو کہتا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے تو میں تیری گردن مار دیتا اور اگر تو یہ کہتا کہ تو نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ یا حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا ہے تو میں تجھے سخت سزا دیتا (۱۲)۔ ایک حدیث جو فقہی اور اخلاقی نوعیت رکھتی ہے حسب ذیل ہے۔

قال حدثنا يوسف عن ابيه عن ابي حنيفة عن ابي غسان عن الحسن عن ابي ذر رضي الله عنه عن رسول الله صلى الله عليه وسلم انه قال يا ابا ذر الامرة امانة وهي يوم القيامة خزي وندامة الا من اخذها بحقها وادى الذي عليه فيها .

یعنی اے ابو ذر رضی اللہ عنہ یا امارہ ایک امانت ہے جو قیامت کے روز ذلت و خواری اور رنج و افسوس میں بدل جائے گی۔ بجز ان لوگوں کے کہ جو اس منصب کو جائز طور سے حاصل کریں اور اس کی ذمہ داریوں کی خاطر خواہ تکمیل کریں۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے ہم سبق فقیہ امام محمد الشیبانی اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد ان الفاظ کا مزید اضافہ کرتے ہیں ” اور اے ابو ذر ایسا کرنا ان کے لئے کیونکر ممکن ہو سکتا ہے (۱۳)۔“

## حوالے اور حواشی

۱ - الرد علی سیر الاوزاعی - مصنفہ امام ابو یوسف - مطبوعہ حیدرآباد (غیر مورخہ) صفحات ۱۳۱ تا ۱۳۵ ایضاً ۳۲ و ۳۳۔

۲ - ایضاً - صفحہ ۷۶۔

۳ - ایضاً - صفحہ ۱۱۔

۴ - کتاب الام - مصنفہ امام شافعی - جلد (۷) صفحہ ۲۳۹ - آخری سطر - صفحہ ۲۲۰۔

- ۵ - محمولہ بالا - مصنفہ امام ابو یوسف صفحہ (۳۰) و ما بعد ۔
  - ۶ - ایضاً - صفحہ (۳۱)
  - ۷ - ایضاً - صفحہ (۳۱)
  - ۸ - ایضاً - (۳۲)
  - ۹ - ایضاً - صفحہ ۲۲ تا ۳۲
  - ۱۰ - ”آثار“ - مصنفہ امام ابو یوسف (مطبوعہ قاہرہ ۱۳۵۵) نمبر ۸۸۷ - ۸۸۹ - اس کا امکان ہے کہ ”الکلام“ کے - معنی صرف ”بات“ کے ہوں لیکن امام ابو یوسف کے زمانہ سے اس لفظ کو فنی اصطلاحی معنی پہنا دئے گئے ہیں -
  - ۱۱ - ایضاً - نمبر (۵۸۱)
  - ۱۲ - ایضاً - نمبر (۹۲۲)
  - ۱۳ - ایضاً - نمبر (۹۲۷) و حاشیہ -
-